خوشیوں کا باغ" ایک وجودی ناول

ظفریاب پی، ایچ، ڈی ریسرچ سکالر شعبہ اردو جامعہ پشاور

ڈاکٹر فرحانہ قاضی، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو جامعہ پشاور

Abstract :

The construct of 'Existentialism' is characterized by different theoretical underpinnings such as pertaining to existence, or in logic, predicating existence. From philosophical perspective, it denotes a vision of the condition and existence of man, his place and function in the world, and his relationship, or lack of relationship with world and God. Modern existentialism is mainly attributed to the pertinent notions of Seren Kierkegaard (1813-55), a Danish philosopher; its main emphasis lies in the existence of individual as free and self-determining agent. The influence of Existentialism can be seen in different disciplines, including literature. In the genre of novel and drama for instance, the impact of modern existentialism became obvious in the writing of Jean-Paul Sartre. In Urdu literature, particularly in fiction, its impact can be seen in the writing of Dr. Anwar Sajad. If on one hand, he is recognized for symbolism and modern tendencies, his fiction is equally characterized by modern existentialism. The present study critically analyzes his novel - Findings reveal the influence of the philosophical wave of modern Existentialism. Since the existentialist can be characterized through his/her capacity of facing anxiety, pursuing authenticity and recuperation of death, similar tendencies are evident in the novel. The study explored motifs such as alienation, quest for self-discovery, portrayal of naked realities of life, uncertainties in life, over-reliance on science and information technology as the dilemma of modern era, and colonial hegemony and otherness as global realities confronting human in different forms. These components of modern Existentialism greatly question the existence of human and make him question his own existence in the modern era. The study offers novel and deep insights of modern existentialism before readers. Finally, this attempt of critically appreciating Anwar Sajad's ---- through the lens of existentialism and discussing the inwards and subjective aspects of human can greatly enhance and enrich the comprehension of readers and make a worthy contribution to the body of research on Urdu fiction, criticism and Urdu literature at large.

دنیائے ادب کے بڑے بڑے وجودی ناولوں پر اگر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو اس میں سب سے پہلے البرٹ کامیو کا "The Stranger" نظر آتا ہے، جس میں ناول کا ہیرو اپنی ماں کے انتقال کے بعد ایک بے یقینی اور بیگانگی کی صورتِ حال سے دو چار ہوتا ہے۔ پھر فرانز کافکا کا "The Metamorphosis" وہ ناول ہے جس کا ہیرو ایک صُبح اُٹھتا ہے تو اُس حلیہ بدل چکا ہوتا ہے اور پھر وہ وجودی کرب، بیگانگی، بے شناختی اور شرمندگی سے دوچار ہوتا ہے۔

اسی طرح کافکا کا ایک ناول "The Castle" میں اس بات کا احاطہ ہوا ہے کہ کس طرح ایک جامد نظام سے انسان پر مایوسی طاری ہوتی ہے۔

سارتر کے ناول "Nausea" میں ایک فرانسیسی تاریخ داں کا قصہ بیاں ہوا ہے جو فرانس کے ایک قصبے میں رہائش پذیر ہے۔ وہ اس وجودی بحران سے نبرد آزما ہوتا ہے کہ اس کی وجود کی حقیقت کیا ہے؟ اور وہ ایک بے معنوی زندگی سے کیوں دوچار ہے؟ لہٰذا اس وجود کے بے حقیقت پن اور زندگی کی اس بے معنویت کو وہ "Nausea" متلی کا نام دیتا ہے۔

وجودی ناولوں میں ایک بڑا ناول البرٹ کامیو کا "The Myth of Sisyphus" ہے جس میں زندگی کی بے معنویت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

اُردو ادب میں بھی کئی ایک ایسے ناول ہیں جن میں وجودی تجربے کیے گئے ہیں۔ "اداس نسلیں"، "راجہ گدھ"، "جنت کی تلاش"، "پریشر کُکر" اور "غلام باغ" وغیرہ میں وجودی کرب، وجودی بحران اور شناخت کے مسئلے سے دوچار کردار نظر آتے ہیں۔

"خوشیوں کا باغ" انور سجاد کا لکھا ہوا وہ ناول ہے جو پاکستان کی سیاسی ابتری سے پیدا شدہ دِگرگوں حالات پر لکھا گیا ہے اور اس صورتِ حال سے گزرتے ہوئے اِس ناول کے کردار ایک وجودی بحران سے دوچار نظر آتے ہیں۔ یہ ایک مختصر ناول ہے جس میں مارکسی سوچ کا حامل کردار ایک ایسے ملک میں سانس لے رہا ہے جس پر استعماری قوتوں کے بیانیے تھوپے گئے ہیں اور ان بیانیوں کے باعث اُس کی شناخت اور پہچان مسخ ہو گئی ہے کیوں کہ بظاہر تو ادھر ملک کی بھاگ ڈور ملکی باشندوں کے ہاتھوں میں ہے لیکن یہاں کے باشندوں کی قسمت کے فیصلے غیر کر رہے ہیں۔

ناول نگار انور سجاد خود ایک مصور، فن کار، رقاص اور دیگر فنون لطیفہ کے ماہر اور دلدادہ ہیں لیکن اُن کے اندر کے فن کار کے لیے باہر کی دنیا ایک سفاک، ظالم اور ناانصاف دنیا ہے۔ اندر سے وہ رنگوں سے کھیلنا چاہتے ہیں لیکن باہر کی دنیا میں اُن کی آنکھوں کے سامنے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے۔

اندر سے وہ اعضاء کے رقص کے متوالہ ہیں لیکن وہ ملک جس کے وہ باشندہ ہیں، اُدھر موت کا رقص برپا ہے۔ اسی اندرونی و بیرونی تضاد و کشمکش سے وہ وجودی بحرانوں بیگانگی، غیر یقینیت، دوسراہٹ، آزادی و اختیار، وجود اور جوہر کے تصادم اور لغویت کو لے کر اپنے ناول کے کینوس پر رنگ بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ ناول "خوشیوں کا باغ" انہی کیفیات اور وجودی وارداتوں کا مجموعہ ہے۔

فلسفہ وجودیت میں وجودی فلاسفر وجود کو مقدم تصور کرتے ہیں۔ اس فلسفے کے تحت انور سجاد نے بھی اپنے ناول کی فضا میں وجود کو اہمیت دی ہے اور ناول کے شروع سے آخر تک دو کرداروں میں "میں" اور "وہ" کا کردار پیش کیا ہے، جس سے وہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ وجود کی شناخت کے لیے نام کی ضرورت نہیں پڑتی۔

"میں" کا کردار ایک فرم میں اکاؤنٹنٹ ہے جو ناول میں اندرونی کشمکش، ذات کی کشیدگی اور ذہنی تناؤ کا شکار ہے جو آخر میں غبن کے الزام میں نوکری سے برخاست کر دیا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ مزید بیگانگی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بعد میں وہ اس غبن اور اپنے گناہ کا ازالہ کر کے وجود سے وابستگی پیدا کر لیتا ہے اور ایک نئی زندگی شروع کرتا ہے۔

انور سجاد اس ناول میں اگرچہ وجودی فلسفے سے متاثر نظر آتے ہیں لیکن عملی زندگی میں وہ ایک سیاست دان بھی رہے ہیں اور مارکسی سوچ کی حامل سیاسی پارٹی کے سرگرم رکن رہ چکے ہیں۔ ناول "خوشیوں کا باغ" جو ۱۹۷۸ء اور ۱۹۸۰ء کے مابین سیاسی افراتفری سے پیدا شدہ گھمبیر حالات پر لکھا گیا ہے۔ اس ناول میں موجود ایک عورت انور سجاد کی مارکسی سوچ کا پرچار کرتی ہے۔

وجودیت ایک ایسا فلسفہ ہے جس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دنیا میں موجود استعماری قوتوں کے بیانیوں اور مہابیانیوں سے تیسری دنیا میں عدم مساوات، غیر انسانی و غیر جمہوری سلوک کا منظر تشکیل پاتا ہے۔ تیسری دنیا کے لوگ اس شناختی بحران سے دوچار ہیں، اس لیے اس ناول میں موجود کردار محض "وہ" اور "میں" تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔

اس ناول میں بتایا گیا ہے کہ استعماری طاقتوں کے ظلم و جبر سے تیسری دنیا میں گھٹن اور بے بسی کی فضا پھیلی ہوئی ہے۔ ناکامی، ناامیدی، مایوسی اور جبر اس معاشرے اور اس کے باسیوں کا مقدر بن گئی ہے جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ عدم تحفظ، معاشرتی ناہمواری اور طبقاتی ظلم سے دوچار ہیں، اس ساری دِگر گوں صورتِ حال سے ایک وجودی بحران نے یہاں کے لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس صورتِ حال کو جو ناول "خوشیوں کا باغ" میں کرداروں کی بیگانگی، لغویت اور دوسراہٹ اور بے یقینیت سے ظاہر کیا گیا ہے۔

تیسری دنیا کا طبقاتی نظام، بے ہنگم آبادی، جہالت، عدمِ مساوات اور معاشرے میں پھیلی ہوئی شُتر گربگی سے جب ایک حساس فرد کا سامنا ہوتا ہے تو وہ وجودی بیگانگی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس ہجوم میں بظاہر تو لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہیں لیکن آپس میں مصدقہ رابطے سے محروم رہتے ہیں، جس کی وجہ سے ہجوم میں بھی ہر ایک شخص کے چہرے پر ایک وحشت نمایاں ہوتی ہے، اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑتی نظر آتی ہیں اور وہ کھویا کھویا نظر آتا ہے۔ اِس صورتِ حال کو انور سجاد نے ناول "خوشیوں کا باغ" میں بہت فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے:

"میرا شہر

افق پر ویران شہر

اگر چہ زندگی یہاں گھورے میں کپڑوں کی طرح کلبلاتی، سرسراتی رواں دواں ہے۔ اسکوٹروں، بسوں، کاروں، رکشوں کے شور سے کانوں کے پردے مرتعش بازاروں میں شاپنگ، پلازوں میں ایک دوسرے کے پاؤں کچلتی، ایک دوسرے کو چھنتی، گورے میں کپڑوں کی طرح کلبلاتی سرسراتی رواں دواں ہے۔ پھر بھی میرا شہر ویران، سنسان ہے۔ روشن ہوتے تاریک اور تاریک ہوتے روشن آسمان کے نیچے یہ ہجوم کتنا ہے۔ لٹکتی زبانوں سے ہر چمکتی دمکتی شے کو چاٹتا ایک دوسرے سے بے تعلق ہجوم۔۔۔ میں کسی کو بھی شناخت نہیں کر پا رہا، کوئی مجھے نہیں پہچانتا۔ کوئی دوسرے کو نہیں پہچانتا، کسی کے پاس کوئی فرصت نہیں اور میں سب سے الگ تھلگ شہر کی بڑی سڑک کے ساتھ چھوٹی سڑک کے اتصال پر بجلی کے کھمبے سے لگا آتی جاتی کاروں اور فٹ پاتھ پر اِدھر اُدھر بھاگتے لوگوں کو دیکھتا ہوں۔"(۱)

وجودی فلسفے میں جوہر کے برعکس وجود کو مقدم سمجھا جاتا ہے۔ وجودیوں کا ماننا ہے کہ اگر ہم موجود کی بجائے جوہر کو مقدم سمجھیں تو دنیا کے تمام سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور معاشی بیانیوں کو زندہ انسان کی نسبت زیادہ اہمیت مل جاتی ہے اور اسی طرح زندہ انسان ان ظالم بیانیوں اور نظریات کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔

ناول "خوشیوں کا باغ" میں انور سجاد نے اسی سارتر ین وجودی فلسفے سے کام لیا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ استعماری طاقتوں کے مہابیانیوں نے انسانی شناخت کو ختم کر دیا ہے۔ اِن بیانیوں سے تیسری دنیا میں مذہبی، سیاسی اور سماجی طور پر لوگوں کا استحصال ہو رہا

ہے۔ انور سجاد کا ماننا ہے کہ اگرچہ ہم میں سے کوئی پاک اور مقدس نہیں لیکن مخصوص نظریات سے وابستگی ہمیں پاکیزگی اور مخالف نظریات کے حامل افراد و اقوام کو بطلان کی سند دیتی ہے۔

"تب فقیہ اور شہر کے لوگ ایک عورت کو لاتے ہیں جو زنا میں پکڑی گئی ہے عورت کو بیچ چوراہے میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔

استاد! یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی ہے توریت میں موسیٰ (ع) نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ایسی عورت کو سنگسار کریں بس عورت کے متعلق کیا کہتا ہے؟

استاد کو ازمانے کے لیے اس پر الزام لگانے کا سبب ڈھونڈنے کے لیے موسیٰ کا حوالہ دیتے ہیں۔

استاد جھک کر انگشتِ شہادت سے زمین پر کچھ لکھنے لگتا ہے۔ وہ استاد سے سوال کرتے ہی رہتے ہیں۔

استاد سیدھا ہو کر ان سے کہتا ہے تم میں سے وہ کہ جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو وہی پہلا پتھر مارے۔ استاد پھر جھک کر انگلی سے زمین پر کچھ لکھنے لگتا ہے۔

یہ سنتے ہی سارا شہر ہاتھوں میں پتھر لیے چل پڑتا ہے۔"(۲)

مذہبی طور پر ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسان کو خدا نے کسی خاص مقصد کے تحت پیدا کیا ہے جب یہ خاص مقصد پہلے سے موجود تھا تو پھر انسانی جوہر اس کے وجود پر مقدم ہو جاتا ہے۔ اب انسان پر ایک خاص فطرت کے مطابق عمل کرنے کی پابندی عائد ہو جاتی ہے۔ اس کی آزادی سلب ہو جاتی ہے اور وہ مجبور و مقہور ٹھہرتے ہیں۔ لیکن "دہری وجودیت" کے علمبردار سارتر اس قسم کے نظریات کو نہیں مانتے اور وہ اس جوہر کے مقابلے میں انسانی وجود کو مقدم مانتے ہیں۔ انور سجاد کے ناول میں بھی انہی نظریات کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ وہ سارتر کے فلسفے "وجود جوہر سے مقدم ہے" کے قائل ہیں۔ سارتر کے اس فلسفے کو سمجھنے کے لیے یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"وجود کو جوہر پر مقدم قرار دینے سے ہمارا مطلب کیا ہے؟ ہمارا مطلب یہ ہے کہ انسان پہلے وجود رکھتا ہے اپنے اپ کا سامنا کرتا ہے، دنیا میں ابھرتا ہے، اس کے بعد ہی اپنے تصور کی تشکیل کرتا ہے۔ وجودیوں کے نزدیک انسان کی تعریف اس لیے محال ہے کہ ابتدا میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اگرچہ یہ عمل انسان کے لیے کٹھن ہے لیکن وہ اس عمل سے گزر کر بہت سارے مسائل سے نجات پا سکتا ہے۔ چنانچہ اس ننگی حقیقت کو پانے کا طریقہ کار وجودی مفکرین یہ وضع کرتے ہیں کہ انسان اس دنیا کے تمام نظریاتی و سائنسی علوم اپنے آپ پر لاگو کرنے کی بجائے پس پشت ڈالے اور اپنی ذات کو ایک برہنگی کے ساتھ قبول کرے۔ بعد ازاں وہی کچھ کرتا ہے جو خود کو بناتا ہے۔ انسانی فطرت نام کی کوئی شے موجود نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خود خدا ہی موجود نہیں جو پہلے سے اس کا تصور کر سکے، انسان تو بس ہے وہ محض وہی کچھ نہیں جو وہ خود کو سمجھتا ہے بلکہ وہ کچھ بھی ہے جو ارادہ کرتا ہے وجود میں آنے کے بعد وہ اپنے

متعلق تصور قائم کرتا ہے اور وجود میں الانگنے کے بعد ہی ارادہ کرتا ہے مختصر یہ کہ انسان صرف وہی کچھ ہے جو کچھ کہ وہ اپنے آپ کو بناتا ہے۔"(۳)

سارتر کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے وجود کو ثابت کرنے کے لیے اپنے ارادوں سے کام لینا پڑتا ہے بصورت دیگر انسان اور دیگر زندہ چیزوں اور جانوروں میں تمیز کرنا ناممکن ہو گا اس بات کی وضاحت سارتر یوں کرتے ہیں:

"انسان صرف اس وقت وجود حاصل کرتا ہے جب وہ وہی کچھ بنتا ہے جو خود کو بنانا چاہتا ہے۔"
(۴)

ناول "خوشیوں کا باغ" میں انور سجاد نہ صرف مذہبی بیانیوں کے خلاف ہیں بلکہ مختلف عالمی سامراجوں کے مسلط کردہ مہا بیانیوں کو بھی انسانی وجود کے لیے زہر قاتل سمجھتے ہیں ان کو رد کرتے ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ ان مغربی بیانیوں سے ہماری ثقافتی شناخت ختم ہو گئی ہے۔ وجودی مفکرین سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے منفی اثرات سے بھی نالاں ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سے انسان ایک بے حیثیت شے بن کر رہ گیا ہے۔ وجودی مفکروں کے ہاں یہ بات بھی نمایاں ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی پر انحصار انسانی گھاٹے کا سودا ہے نیز پیٹ پوجا اور جانوروں کے شکار کے لیے جو ہتھیار وضع ہوئے تھے وہ ہتھیار آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی بدولت ٹینک و آبدوز کی شکل میں ڈھل کر انسانی شکار کے کام آ رہے ہیں۔ ناول "خوشیوں کا باغ" میں بھی یہی فلسفہ نمایاں ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو؛

"انسان کی تہذیبی ارتقا کو سمجھنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان ہتھیاروں کا مطالعہ کیا جائے جو مختلف ادوار میں انسان نے ایجاد کیے اور تعظیم کرو اس پہلے انسان کی کہ جس نے پہلے ہتھیار سے درندے کی بجائے انسان کو شکار کیا۔"(۵)

"خوشیوں کا باغ" میں یہ وجودی فلسفہ بھی نمایاں ہے کہ انسان اپنی ذات کے متعلق ننگی حقیقت سے آشنا ہو کر بہت سارے مسائل کا حل نکال سکتا ہے؛

"انسان کا سب سے بڑا جرم حقیقت کا ادراک نہ کرنا ہے۔ اس حقیقت کا ادراک کہ جس سے وہ ننگے ہو جائیں جو چھپتے ہوئے ملبوسات میں برہنگی چھپاتے ہیں۔"(۶)

"خوشیوں کا باغ" ایک مخصوص سیاسی پس منظر میں لکھا گیا ناول ہے۔ اس سیاسی نظام سے پاکستانی معاشرہ عدم استحکام کا شکار ہوا۔ معاشرے میں غیر یقینیت کی فضا پیدا ہوئی اور ناول کے کردار تلاشِ ذات کے سفر پر روانہ ہوئے، اس تلاشِ ذات کا ایک پڑاؤ عدم یقینیت کا مقام ہے اور یہ مقام اس سفر میں تب آتا ہے جب انسان کا اپنی ذات اور اپنے ارد گرد پھیلی دنیا پر یقین ختم ہو جاتا ہے۔ سماج اگرچہ انسان کو ایک تصورِ ذات دیتا ہے لیکن چوں کہ یہ تصور غیر مصدقہ ہوتا ہے لہٰذا انسان اس کو قبول کرنے سے کتراتا ہے۔ وجودی فلسفے میں یہ عمل ایک طرح سے انسانی عقل پر مطمئن نہ ہونے کا نتیجہ ہے اور یہی بے یقینی کی فضا اس ناول میں جا بجا ملتی ہے۔

"انتہائی پُرسکون زندگی میں ایک بلبلہ جانے کہاں کیوں اُبھرتا ہے جو پھیلتا پھیلتا غبارہ بن جاتا ہے۔ پھر اس زور سے پھٹتا ہے کہ میں دہل جاتا ہوں۔ میں کچھ سمجھنا نہیں چاہتا۔ کچھ سوچنا نہیں چاہتا۔ مجھ سے تجزیہ نہیں ہوتا۔ مجھے خوف آتا ہے، آپریشن سے پوسٹ مارٹم سے۔۔۔ میری زندگی میرے پیروں تلے کھسکنے لگتی ہے۔"(۷)

لغویت بھی وجودی فلسفے کا ایک اہم پہلو ہے جس میں اس دنیا کی بے معنویت کا احساس ہوتا ہے۔ وجودیوں کا ماننا ہے کہ انسان نہ چاہتے ہوئے اس دنیا میں زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ انسان جب بغیر مرضی کے زندگی گزارتا ہے تو وہ ایک نوع کی اکتاہٹ اور بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب وہ اپنے اردگرد ظلم، دکھ، ناانصافی، بربریت و انتشار کو دیکھتا ہے اور اس بات کی جڑ تک پہنچنے سے قاصر ہوتا ہے کہ اس کا حل کیا ہے تو اس کے من میں بے معنویت کا ایک چشمہ پھوٹتا ہے۔ ”خوشیوں کا باغ“ اسی فلسفے کا عکاس ناول ہے۔ طبقاتی دوڑ سے پیدا شدہ صورتِ حال اور معاشرے میں پھیلی مایوسی اور انتشار کو جب انور سجاد کے کردار محسوس کرتے ہیں اور اس کی عقلی توجیح نہیں کر پاتے تو بے معنویت اور غیر یقینیت کا احساس اُبھرتا ہے۔ یہ فلسفہ بے معنویت البرٹ کامیو کے نظامِ فکر سے مماثل ہے، جس کے بارے میں قاضی جاوید لکھتے ہیں:

> ”عہدِ رفتہ کے فلسفیانہ نظاموں کے تجزیے سے کامیو اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ان میں سے کوئی نظام بھی حیاتِ انسانی کے لیے مثبت رہنمائی فراہم نہیں کر سکتا اور نہ ہی انسانی اقدار کی معقولیت کی ضمانت دے سکتا ہے۔ اس نتیجے کے شعور ہی سے وہ خود اسی صورتِ حال میں پاتا ہے جسے ”اسطورسی فس“ میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ مضمون بظاہر ہر خودکشی کے مسئلے سے تعلق رکھتا ہے۔ جو کامیو کے نزدیک واحد سنجیدہ فلسفیانہ مسئلہ ہے۔ یہ نتیجہ ہے دنیا کی لغویت کا، دنیا کا کوئی جواز نہیں۔ یہ سرتاپا لغویت ہے۔ یہ ہر قسم کے نصب العین یا آدرش سے محروم ہے۔ ہمیں صداقت کی جستجو ہے۔ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ اس کائنات کہ جس میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں۔ ماہیئت کیا ہے؟ اس کی تخلیق کیوں کی گئی ہے؟ اس کا خالق کون ہے؟ تاریخ کیا ہے؟ اور زندگی کا مقصد کیا ہے؟ مفہوم تک رسائی کی ہماری یہ جستجو کامیاب نہیں ہو سکتی کیوں کہ مفہوم موجود ہی نہیں جس کو دریافت کیا جا سکے۔ غیر معقول کائنات کو سمجھنے کی جدوجہد ہی لغویت کا سبب ہے۔“(۸)

مجموعی طور پر اگر ”خوشیوں کا باغ“ پر وجودی فلسفے کے اثرات کی بات کی جائے تو ایک مخصوص سیاسی صورتِ حال سے پیدا شدہ عدم استحکام سے فرد ایک بے یقینی اور بے چینی کی صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے۔ اس پراگندہ سیاسی نظام سے معاشرے میں غربت، بھوک اور افلاس کے سائے گہرے ہوتے ہیں۔ پرانی اقدار مٹ رہی ہیں اور جدید دنیا اپنی تمام تر بربریت کے ساتھ انسانی وجود کے لیے خطرہ بن رہی ہیں۔ اسی بات کو لے کر ناول نگار انور سجاد عقل و منطق سے زیادہ وجودی جذبات و احساسات کے قائل نظر آتے ہوئے، ناول کے پلاٹ کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اس ناول میں موضوعی کیفیات کا عمل دخل زیادہ ہے۔ ناول کے کردار ایک قسم کی بیگانگی، مغائرت، کرب اور دہشت سے دوچار ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے ظلم اور بربریت کی وجہ سے زندگی کی حقیقت کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔

انور سجاد نے عملی سیاست میں رہ کر سامراج اور اس کے کارندوں کا کریہہ چہرہ قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے اور ان کی وجہ سے جس صورتِ حال نے جنم لیا ہے اس وجودی کرب کو بھی محسوس کیا ہے جس کا بھرپور احاطہ انھوں نے اپنے ناول ”خوشیوں کا باغ“ میں کیا ہے۔

حوالہ جات:

۱. انور سجاد، ''خوشیوں کا باغ''، شعور پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء، ص:۲۰

۲. ایضاً، ص:۴۸

۳. ژاں پال سارتر، ''وجودیت اور انسان دوستی'' (مترجم: قاضی جاوید)، ص:۱۶،۱۷

۴. ایضاً، ص:۱۷

۵. انور سجاد ''خوشیوں کا باغ''، محولہ بالا، ص:۳۶

۶. ایضاً، ص:۴۰

۷. ایضاً، ص:۴۸

۸. قاضی جاوید، ''دنیا لغو ہے''، مشمولہ: ''کامیو البیئر: فکر و ادب کے آئینے میں''، ص:۴۲